ترقی پسند افسانے میں نفسیاتی شعور (ہسٹیر یا کے حوالے سے)

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی*

Abstract:

Progressive literary criticism drew a line between social problems and psychological problems, placing social problems based literary works on one side of the line and psychological problems based literature on the opposite side. This paper explores the silent features of the progressive Urdu short story writers who deal with the opposite side of the line(Psychological problems).

ترقی پسند افسانہ ہر اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔اس میں اپنے مخصوص خصائص کے علاوہ نفسی جنسی الجھاؤ کا فنکارانہ اظہار بھی ہے، تحلیلِ نفسی کی رمز بھی، سرئیلزم کے ابتدائی نقش ہیں تو وجودی مباحث کی تخلیقی جہات بھی موجود ہیں۔اس روایت میں رومانی لب ولہجہ ہے تو صدیوں کو چیرتی ہوئی بلند آہنگ صدا کا ارتعاش بھی موجود ہے۔ اس روایت میں جہاں فنی علائم ورموز' اسالیبِ بیان' افسانوی فن کے سکہ بند اصولوں کی پاسداری نظر آتی ہے تو روایت سازی کے اسباب بھی دکھائی پڑتے ہیں۔غرض کہ ترقی پسند افسانہ کسی بھی حیثیت مار کھانے والا نہیں ہے۔تنقید اور تخلیق کے بُعد نے سارے معاملے کھڑے کیے ہیں۔ترقی پسند تنقید نے لگے بندھے اصولوں کے تحت ترقی پسند افسانے کا جائزہ لیا اور ان موجود عوامل کو نظر انداز کر گئے جو ترقی پسند فکر سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔اس کی ایک مثال ترقی پسند افسانے میں نفسیاتی صداقتوں کا اظہار ہے کہ جس کی طرف ترقی پسند تنقید نے زیادہ توجہ نہیں کی کہ یہ جہت ان کے نظریے سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد پہلو تھا، البتہ جنسی موضوعات کو مشروط انداز میں قبول کیا گیا۔یوں نظریے کی حدود وقیود نے خود اپنوں کی وسیع دُنیا کو محدود انداز میں پیش کیا۔

نفسیاتی مباحث سے مارکسی ناقدین کی دوری بے سبب بھی نہیں۔مارکسی فکر کی رو سے انسانی مسائل کی اصل وجہ خارجی حقائق میں ہے جبکہ نفسیات دانوں کے مطابق انسانی مسائل کے سوتے خود اس کے باطن سے پھوٹتے ہیں۔نفسیات دانوں نے انسانی لاشعور کی مدد سے اس کے گرہ بستہ مسائل کی کشادکاری پر زور دیا۔مارکسی

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

مفکرین نے معاشرتی ناہمواریوں کو مرکز جانا۔فرائیڈ اور کارل مارکس کے اس بُعد کو ایرک فرام اور کیرن ہارنی نے کم کرنے کی کوشش لیکن نظری مباحث میں اُلجھے ہوئے ناقدین نے اپنے اپنے کناروں پر ہی ٹھہرنے میں عافیت جانی۔اس پاٹ کو تخلیق فنکاروں نے پار کیا اور دونوں حوالوں کو ایک جا کر کے امکانات کی دُنیا کو وسیع کیا۔

مارکسی اور نفسیاتی مفکرین کے مابین زاویہءنظر کے اختلاف اور دونوں نظریوں کے اپنے الگ الگ امکانات کے سبب یہ فرض کر لیا گیا ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تخلیقی جڑت ان نفسیاتی صداقتوں سے نہیں ہے کہ جن کی بنیاد فرائیڈ کے ادبی محاکموں میں رکھی گئی تھی۔نفسیاتی شعور کے نام پر بھی بڑی گڑبڑ پھیلائی گئی۔ بیدی کے ہاں اگر لمبی لڑکی کے بر ڈھونڈنے پر اس کی دادی کو تشویش ہے تو اسے بھی بیدی کا نفسیاتی شعور قرار دیا گیا۔ باپ علی الصباح اپنے بیٹے کا ایک سگریٹ پی لیتا ہے اور کنکھیوں سے اپنی چوری کے پکڑے جانے کے انتظار کی سولی پر لٹکا ہے تو یہ بھی ایک نئی طرح کا نفسیاتی شعور ہے۔اپنے شوہر کے لیے گرم کوٹ کی آرزو کی نشاندہی بھی اسی ذیل میں آ گئی اور تو اور پریم چند کے ہاں بھی اس کی راہ نکال لی گئی کہ مادھو اور گھیسو ان کے نفسیاتی شعور کے آئینہ دار ٹھہرے۔منٹو کی نفسیاتی تعبیریں بھی بڑے غلط انداز میں ہوئیں۔ظلم ہے جو ان کے افسانوں ''بانجھ'' اور ''ڈرپوک'' کو تحلیلِ نفسی کے افسانے قرار دے کر جگدیش چندر نے نفسیاتی محاکمہ پیش کیا حالانکہ انہیں ''مس ٹین والا'' میں بلّے سے خوف اور ''سوراج کے لیے'' میں دانتوں تلے ربڑ چکچانے کے احساس پر مبنی افسانوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے تھا۔عصمت کے نفسیاتی شعور کا سکہ ''لحاف'' کے سبب بٹھانے کی کوشش ہوتی رہی۔غلام عباس کے ''اوورکوٹ'' کا شہرہ دوہری شخصیت کے حوالے سے خوب ہوا لیکن دوہری شخصیت کے نفسیاتی مباحث کسی طور اس کہانی میں موجود صورتِ حال کی تائید نہیں کرتے۔دوہری شخصیت کی نفسیات اجاگر کرنے والے افسانوں میں ممتاز مفتی کے ''آدھے چہرے''، ''دومونہی''، ''بش اور بشریٰ''، ''اندروالی''، ''بدمعاش'' اور ''کہانی کی تلاش'' جبکہ انتظار حسین کا ''وہ اور میں''، رشید امجد کا ''بے زار آدم کے بیٹے'' بانو قدسیہ کا ''نقل مکانی'' قابلِ ذکر افسانے ہیں۔اُردو تنقید میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ جن میں نفسیاتی شعور کے نام پر گمراہ کن نتائج اخذ کیے گئے۔

اگر نفسیاتی شعور کا کڑا معیار مقرر کرتے ہوئے اسے صرف نفسیاتی الجھاؤ کے داخلی موجبات اور نفسیات دانوں کے نظریات تک محدود کر دیا جائے تو اُردو افسانے کی روایت میں سے بہت کم افسانے اس پر پورے اتریں گے۔نفسی رمزیت اور نفسیاتی شعور میں فرق روا رکھا جانا چاہیے۔مثال کے طور پر غلام عباس کے افسانے ''بابے والا'' میں ریٹائرڈ اور گھروں میں حیثیت کم ہو جانے والے بوڑھوں کے جذبات واحساسات نفسی رمزیت کے ساتھ سامنے آئے ہیں لیکن اس افسانے میں کسی نفسیاتی حقیقت سے پردہ نہیں اٹھایا گیا۔نفسیات شناسی پر جو زعم منٹو کو تھا اس کا بلاتکلف اظہار اس نے اپنے مضامین اور افسانوں میں بارہا کیا ہے۔منٹو کی نفسیات شناسی کا سب سے بڑا ثبوت ''مس ٹین والا'' ہے جو خالصتاً تحلیلِ نفسی کے انداز سے جا کر ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔منٹو نے خبط کے حوالے

سے تحلیل نفسی کی جو باریکی مذکورہ افسانے میں پیش کی ہے اس کا اظہار ان افسانہ نگاروں کے ہاں بھی نظر نہیں آتا جو تحلیل نفسی کے نظریات سے بخوبی آشنا تھے۔منٹو نے بڑے قرینے سے انسان کے ظاہری اعمال، خوف اور وسوسوں کو ابتدائی زندگی کے حالات وواقعات اور حادثات وغیرہ کی روشنی میں دیکھا ہے۔زیدی دیگر بلوں سے خوف زدہ نہیں، صرف خاص بلے سے اس لیے ہے کہ اس بلے کی مشابہت ہم جنس پرستی کے حامل اس کردار سے ہے کہ جس کے خوف سے زیدی اپنے بچپن میں دو دن ہذیانی کیفیت میں رہا تھا۔ بلے کو دیکھ کر وہی ہذیانی کیفیت لاشعور میں اُمڈنے لگتی ہے۔یہ سارے عوامل نفسیاتی حقائق ہیں کہ جنھوں نے تخلیقی شان کے ساتھ افسانے میں جگہ پائی ہے۔اس خوف کو نفسیاتی اصطلاح میں ''Ailuraphobia'' کہا جاتا ہے۔یقیناً منٹو نہ تو اس نفسیاتی اصطلاح سے واقف تھا اور نہ ہی اس نے نفسیاتی نظریات کے مطالعوں کی بنیاد پر افسانے لکھے۔یہی تخلیق کار کی وہ خداداد صلاحیت اور بصیرت ہے جس کا اعتراف ہر عہد کے نمایاں نفسیات دانوں نے نہ صرف کیا بلکہ شکر گزاری کے جذبات کا اظہار بھی کیا۔منٹو نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے سبب زیدی کے خوف کو اس کے اوائل عمری کے ناخوش گوار تجربات کی روشنی میں تلاش کر کے دکھایا اور اس امر کی تصدیق نفسیاتی نظریوں سے بھی ہوتی ہے۔تخلیق کار کے اسے خداداد وصف کی موجودگی کا احساس فرائیڈ کو بھی تھا۔اس لیے اس نے تخلیقی فنکاروں کو لاشعور کا موجد قرار دیا اور انہیں ''قابلِ قدر'' ساتھی کہا:

> "Imaginative writers are valuable colleagues.... in the knowledge of human heart, they are far ahead of us.... because they draw on source that we have not made accessible to science." (۱)

نفسیاتی شعور کے اس معیار پر اگر ترقی پسند افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو مایوسی نہیں ہوتی، صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ نظریے اور فن کے بُعد کے سبب کئی پوشیدہ مفاہیم عیاں نہیں ہو پائے۔ترقی پسند افسانے میں ہسٹیریا کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے اگرچہ کم معروف ہیں لیکن ادب اور نفسیات کے باہمی اشتراک کی ایک عمدہ مثال ہیں۔شاید یہ امر دلچسپ ثابت ہو کہ یورپ کے ماقبل از تاریخ سے تعلق رکھنے والے مذاہب بالخصوص اساطیری جرمن ادب کی پس ماندہ یادگاروں میں ''کالاعلم'' بہت مدت تک مذاہب کے ساتھ ساتھ متوازی انداز میں چلتا رہا۔ہسٹیریا کے مظاہر اور کالے علم کے ماہرین کے مظاہر میں حد درجہ مماثلت موجود تھی۔اسی مماثلت کے سبب تاریخ انسانی نے مدتِ مدید تک ہسٹیریا کو آسیب اور جھاڑ پھونک سے وابستہ کیے رکھا۔سبت' بھوت پریت سے متعلق تقریبات اور رسوم انسانی تاریخ میں دُور تک سفر کرتے رہے۔

بیسیویں صدی کی سائنسی تحقیقات اور فرائیڈ کی جنسی نظریات نے آسیب زدگی اور بھوت پریت کے اس تصور کا نشان تک مٹا دیا جو جرمن کے اساطیری مذہب کی یادگار تھا اور جس کی روشنی میں ہسٹیریا کو پرکھا جاتا ہے۔اُردو

افسانے کی روایت میں ترقی پسند افسانہ بھی جدید عہد کا نفسیاتی اور سائنسی شعور لیے اپنی راہیں بناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اُردو افسانے نگاروں نے ہسٹیر یا کے حامل کرداروں کو آسیب زدگی یا ساحری کی بجائے نفسیاتی اسرار کے ساتھ پیش کیا۔

ہسٹیر یا کے ادبی تصورات کی آئینہ داری کا آغاز ایک ایسے افسانہ نگار سے ہوتا ہے کہ جسے بھلائے ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔اختر اور ینوی بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار ہیں۔ترقی پسند افسانے کے اہم تر ناقدین بھی ان کا سرسری سا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔(۲) جبکہ انہوں نے سکہ بند ترقی پسند نظریات اور اپنے پیش رو پریم چند کی مانند دیہی زندگی میں جاگیردار طبقے کی حاکمیت اور کسان کی لاچاری کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ہاں ایسے مجبور کسان بھی نظر آتے ہیں کہ جن کے اپنے بچے دودھ کی ایک بوند کے لیے بلک رہے ہیں لیکن لگانکے طور پر کئی من دودھ انھیں مہیا کرنا پڑتا ہے(دومائیں) کم عمری میں جاگیردار کے گھروں میں ملازمت پیشہ بچے اوران کے نفسیاتی مسائل بھی ان کے تخلیقی احساس کی نمایندگی کرتے ہیں (تسکین حسرت) بے روزگاری کے ہاتھوں محتاج، بے کار اور معاشرے کا قابل رحم طبقہ بن جانے والے ان کے اہم تخلیقی کردار ہیں کہ جو اس عہد کے نفسیاتی مسائل کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں (کام' آخری اکنّی ، جونیئرَ) اختر اور ینوی نے ترقی پسندانہ فکر کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حقائق کو بھی مدِ نظر رکھا۔سماجی طرزِ حیات میں بے انصافی' طبقاتی تفاوت اور اجارہ داری جن نفسیاتی مسائل کو ابھارتی ہے' ان گرہ بستہ باطنی مسائل کی کشادکاری اور ینوی کے ہاں ہوئی ہے۔اختر اور ینوی کے افسانوی کردار سہمے ہوئے نہیں ہیں۔انتہائی پسپائی' شکستگی' کسمپری اور مظلومی ان کرداروں میں انقلاب کا جذبہ بیدار کردیتی ہے اور وہ بسا اوقات مقتدر ہستیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔(تسکینِ حسرت)

اگرچہ دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی مانند اختر اور ینوی کا بیش تر تخلیقی سرمایہ خارجی حیات' اس کے گوناگوں مسائل کے ادراک اور سماجی مسائل کے اثرات سے عبارت ہے لیکن یہ اور ینوی کے افسانوں کی یک رخی تصویر ہے۔تصویر کا دوسرا رخ خالصتاً نفسی جنسی مسائل اور لاشعوری قوتوں کے غلبے کا منظر دکھاتا ہے کہ جس سے ترقی پسند نقاد قدرے کراہت' بے زاری اور عدم قبولیت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔یوں ترقی پسند نقاد اس تحریک سے وابستہ تخلیق کاروں کے مخصوص نظریات کو نمایاں کر کے اوران کے دیگر پہلوؤں کو نظرانداز کر کے خود اپنے ہی رہزن ٹھہرے۔۱۹۴۵ء میں حیدرآباد کے اندر منعقد ہونے والی ترقی پسند کانفرنس میں حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار نے جنسیت پر لکھنے والوں سے لاتعلقی کی قرارداد کی مخالفت کی تھی۔اس وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ جنسی موضوعات کو محض جنس کے طور پر نہیں بلکہ سماجی مسئلے کے طور پر لیا جائے گا' بعدازاں اس تخصیص کو بھی ختم کردیا گیا اور منٹو کو نکال باہر کردیا گیا۔اگر قبولیت کا دائرہ ذرا وسیع کردیا جاتا تو اس تحریک کو طعنے سننے کو شاید نہ ملتے۔خالصتاً نفسیاتی شعور کہ

جس کی وضاحت کی جا چکی ہے' ترقی پسند افسانہ نگاروں کا وہ پہلو ہے کہ جس کی طرف ترقی پسند ناقدین نے آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند اس لیے بھی نہ کیا کہ اس سے انسان کے بنیادی مسائل کی جڑیں خارجی زمینوں کے ساتھ داخلی گہرائیوں میں زور پکڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور انسانی مسائل کے یکتا تصور کم زور پڑ سکتا تھا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انسان کے بنیادی مسائل کا سراغ باہر کی دُنیا کے ساتھ ساتھ اس کی اندرونی حیات سے بھی لگایا۔ پریم چند کے افسانے ''نئی بیوی'' اور ''مالکن'' نے بہت ابتدائی سطح پر اس ضمن میں چند اشارے فراہم کیے لیکن اس کی بامعنی حیثیت کا اندازہ اختر اور ینوی کے ہاں ہوتا ہے۔ اختر اور ینوی نے ہسٹیر یا کو سماجی مسئلے کے طور پر ضرور محسوس کیا لیکن انہوں نے اس مسئلے کی تعبیر باہر کی دُنیا کی بجائے اندر سے کی۔ اس حوالے سے ان کے دو افسانے ''یہ دُنیا'' اور ''ممتا'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''یہ دُنیا'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہونے والے ان کے مجموعے ''منظر و پس منظر'' میں شامل ہے جبکہ ''ممتا'' نقوش کے افسانہ نمبر شمارہ ۳۷۔۳۸ میں شائع ہوا۔ ہسٹیر یا حوالے سے منٹو کے افسانے ''مس اڈنا جیکسن''، عصمت '' کے لحاف'' اور ممتاز مفتی کے ''موقعہ'' کی بڑی دھوم ہوئی لیکن اختر اور ینوی کا ایک افسانہ ''یہ دُنیا'' اپنے موضوع اور فنی محاسن دونوں اعتبار سے اس موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ حسن عسکری کے تینوں افسانے ''اندھیرے کے پیچھے''، ''چاے کی پیالی'' اور ''وہ تین'' اختر اور ینوی کے مذکورہ مجموعے سے تین سال بعد ''جزیرے'' میں ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئے تھے ممتاز مفتی کا ''موقعہ'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جاے تو ہسٹیر یا کے موضوع پر اختر اور ینوی کا افسانہ اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے۔

اختر اور ینوی کے افسانے کی وساطت سے اُردو افسانے نے آغاز ہی میں ''ہسٹیر یا'' کو جنسی جبلتوں کی نا آسودگی کے تناظر میں پیش کیا۔ اس خلل کو آغاز ہی سے عورتوں سے زیادہ منسوب کیا گیا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ جنسی زندگی میں مردوں پر تاریخ انسانی میں قدغن لگانے یا اسے قبیح تصور کرنے کی روایت نہیں ملتی جبکہ عورتیں جنسی امنگوں کے اظہار اور ان کی آسودگی کے حوالے سے حدود قیود کے سانچے میں رہی ہیں۔ کبھی یہ حدود حیاداری کے جذبہ کی صورت میں تو کبھی معاشرتی' مزہبی اور خانگی ممنوعات کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ مرد ان حدود و قیود سے مستثنٰی رہے ہیں۔ تاہم صورت جو بھی ہو اختر اور ینوی کا یہ افسانہ بے جوڑ ازدواجی زندگی کے عوامل کو سامنے لاتا ہے۔ افسانے کا حسن ''ہسٹیر یا'' کے پس منظر کا بیان ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ مرکزی کردار (راشدہ) کی باطنی زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو بتدریج تشویشی بگاڑ کی ایک قسم تحویلی ہسٹیر یا کی جانب لے جاتے ہیں۔ منٹو اور عصمت کے ہاں کرداروں کے نفسیاتی الجھاؤ کا فنکارانہ اظہار ان کی شناخت کا ایک وسیلہ ٹھہرتا ہے۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے کرداروں کی باطنی کشمکش کے فنی جہت پر زور دیتے ہوئے اپنے عہد کی ممنوعات کو بھی چھوا اور پھر مقدمات کا بھی سامنا کیا۔ اگرچہ عصمت کا ''لحاف'' اور منٹو کے ''مس اڈنا جیکسن''، ''مس ٹین والا''، ''خالد میاں''، ''ڈرپوک''، ''سوارج کے لیے''، ''پانچ دن'' وغیرہ ایسے کئی افسانے

نفسیاتی اسرار کے حامل ہیں تاہم اس طرز کے نفسیاتی حقائق ان افسانہ نگاروں سے قبل اختر اور ینوی کے ہاں نمایاں ہو چکے تھے۔اس افسانے کا حسن یہ ہے کہ مصنف نے ہسٹیریا کے دوروں کی تفصیل بیان کی ہے اور نہ ہی اس کی وحشتوں سے افسانے کی فضا کو بوجھل بنایا ہے۔اختر اور ینوی نے رشتہء ازدواج میں ان معمولی معمولی واقعات کو نمایاں کیا ہے جو دراصل معمولی نہیں ہوتے اور ہسٹیریا کی وجہ بن جاتے ہیں۔اختر اور ینوی نے بڑی چابک دستی سے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بڑی حویلی' نوکر چاکروں کی فوج' مال و دولت کی فراوانی اور معاشرتی و معاشی استحکام بھی فرد کو زیادہ دن جذباتی آسودگی دینے سے قاصر رہتا ہے۔اختر اور ینوی کے خیال میں اگر جنسی جبلتیں آسودہ نہ ہو سکیں تو وہ فرد میں ایسا انتشار پیدا کر دیتی ہیں کہ جس کا سلجھاؤ مثالی معاشرتی اور معاشی زندگی سے بھی نہیں ملتا۔اختر اور ینوی نے ''یہ دُنیا'' میں مرکزی کردار (راشدہ) کے ہیجان اور باطنی انتشار کو نمایاں کر کے اُردو افسانے میں کردار نگاری کے باطنی مظاہر کی ابتدائی رویت قائم کی۔

اُردو افسانے میں فطری انسان کی بازیافت اہم موضوع ہے۔بازیافت کے اس تخلیقی عمل کے دوران اُردو افسانہ نگاروں نے بعض ایسے کرداروں کی بھی نشاندہی کی جو اپنی فطرت سے بہت دور چلے گئے اور اسی دوری سے ان کے ہاں نفسیاتی الجھنوں کا ظہور ہوا۔افسانہ نگاروں نے انسان کے ہر اس عمل کو غیر فطری قرار دیا ہے جو کہ انسان کے بنیادی خصائص سے پرے ہو۔اس حوالے سے منٹو کی یہ سطور قابلِ ذکر ہیں:

> ''فطرت کی خلاف ورزی ہرگز ہرگز بہادری نہیں۔یہ کوئی کارنامہ نہیں کہ تم فاقہ کشی کرتے کرتے مر جاؤ یا زندہ رہو۔قبر کھود کر اس میں گڑ جانا اور کئی کئی دن اندر دم سادھے رکھنا، نوکیلی کیلوں کے بستر پر مہینوں لیٹے رہنا، ایک ہاتھ برسوں اُٹھائے رکھنا حتیٰ کہ وہ سوکھ کر لکڑی ہو جائے۔ایسے مداری پنے سے خدا مل سکتا ہے نہ سوارج۔'' (۳)

اُردو افسانے میں حد سے بڑھی ہوئی اور ڈھونگ محسوس ہونے والی اخلاق پرستی' مذہب پرستی' اور اقدار پرستی وغیرہ کے خلاف جو احتجاج نظر آتا ہے' اس باب میں اختر اور ینوی پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کا افسانہ ''ممتاز'' فطری جذبوں اور امنگوں کو دبانے کے ہولناک انجام کو سامنے لاتا ہے۔اس موضوع کی معنوی توسیع بعد ازاں منٹو کے ہاں ''پانچ دن'' اور ''سوارج کے لیے'' میں ہوئی۔اس امر میں شبہ نہیں کہ انسان کی آرزو اور بے لگام خواہش اکثر اوقات معاشرتی تار و پود سے متصادم ہوتی ہے۔ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ عمرانیات اس امر پر متفق ہیں کہ معاشرتی فلاح اور اس کی ترقی کے لیے انسان کو اپنی منہ زور اور بے لگام خواہشات کو معاشرتی حدود کے تابع رکھنا چاہیے اور اسی اطاعت سے صحت مند معاشرے پیدا ہوتے ہیں۔اخلاقی تشویشی بگاڑ کا تعلق ان آرزوؤں اور خواہشات سے نہیں سے جو حیوانی مزاج کی آئینہ دار بنتی ہیں بلکہ ان فطری جذبوں اور فطری خواہشات سے ہے کہ جنہیں مذہب' اخلاق اور معاشرتی اقدار کے خود ساختہ تصور کے تحت دبا دیا جائے۔فطری امنگوں اور فطری خواہشوں

کو اخلاقی اقدار کی بے ضرورت پاسداری کے تحت دبانے سے اخلاقی تشویشی بگاڑ جنم لیتا ہے۔ اس خلل کے حامل افراد بلاضرورت خود اذیتی اور جبر میں خود کو مبتلا رکھ کر انسانی فطرت اور نارمل طرزِ حیات سے بہت دور جا پڑتے ہیں اور ان کے لیے زندگی کے معمولات مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس نفسیاتی حقیقت کو اختر اور ینوی نے تخلیقی شان کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

ہسٹیریا کے ادبی تصورات کی آئینہ داری خواجہ احمد عباس کے افسانے ''مسوری ۱۹۵۳ء'' سے بھی ہوتی ہے۔ یہ افسانہ رسالہ ''نقوش'' کے اولیں افسانہ نمبر شمارہ ۳۷-۳۸ میں شائع ہوا۔ افسانے میں بلوغت کی عمر کو پہنچنے والی لڑکی ''شمو'' کے ہسٹیریا کا انوکھا انداز سامنے آتا ہے۔ افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نفسیاتی نظریوں بالخصوص سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات اور اس کی وضع کردہ اصطلاحات سے بخوبی واقف تھے۔ نفسیات سے خواجہ احمد عباس کی گہری واقفیت کے سبب اس افسانے میں ہسٹیریا کی ایک صورت سامنے لائی گئی ہے کہ جس کی طرف دیگر لکھنے والوں کا کم ہی دھیان گیا ہے۔ الیکٹرا الجھاؤ لڑکیوں میں پایا جاتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے مذکورہ افسانے میں ''شمو'' کے الیکٹرا الجھاؤ کو نمایاں کیا ہے کہ اسے مناسب انداز میں والد کی شفقت حاصل نہیں ہونے پاتی اور اس کے والد کی توجہ کا زیادہ حصہ شمو کی سوتیلی ماں کے حصے میں آتا ہے۔ شفقت بھری توجہ سے بچوں کی محرومی ان میں مختلف نوعیتوں کے ذہنی نفسیاتی عارضوں کو جنم دیتی ہے۔ اگر بچوں میں محرومی کا شدید احساس اپنی جڑیں دور تک پھیلا لے تو لاشعوری دُنیا سے ہسٹیریا کے دورے نمو پذیر ہوتے ہیں۔ افسانے کے آخری حصے میں خواجہ احمد عباس گہرے نفسیاتی شعور کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''تمھارے پاپا کی تشخیص صحیح نکلی۔ شمو کے پیٹ کا درد واقعی ہسٹیریا کی ایک نئی شکل نکلا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا ''سب کونشیس''، یعنی تحت الشعور اپنے پتا جی کی توجہ سوتیلی ماں کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کرتا ہے۔''(۴)

قیامِ پاکستان کے آس پاس نفسیات سے آگہی کی جو لہر تخلیق کاروں کے ہاں ابھری، نہ جانے کیوں اس میں لاشعور اور تحت الشعور کو گڈمڈ کر دیا گیا۔ خواجہ احمد عباس کے ہاں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ غالبًا ان کا اشارہ شمو کے لاشعور کی طرف ہوگا مگر انھوں نے اس کی بجائے ''سب کونشیس'' کی اصطلاح برتی۔

خواجہ احمد عباس نے کچھ افسانے جنس کے نمایاں مظاہر پر لکھے (نیلی ساڑھی، شکر اللہ) مگر ''مسوری ۱۹۵۳ء'' جنس کے ظاہری عوامل کے بجائے لڑکیوں کے بہت ہی نازک لاشعوری تصور پر لکھا گیا ہے اور ہمارے خیال میں اپنی بنت کے سبب خواجہ احمد عباس کا نفسیات کے حوالے سے یہ نمائندہ ترین افسانہ ہے۔ بچے مناسب توجہ نہ ملنے پر کن کن نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی الجھنیں توجہ حاصل کرنے کی لاشعوری امنگ کی آئینہ دار بن جاتی ہیں۔ ان نازک خیالات کا بار خواجہ احمد عباس کے افسانے نے یوں اٹھایا ہے کہ اس پر کیس ہسٹری کا بھی گمان گزر جاتا ہے۔

عصمت چغتائی ترقی پسند افسانہ نگاروں میں اپنی زبان، کھوکھلی زندگی کے چھوٹے مظاہر، متوسط گھرانوں کے گہرے معاملات اور بے باکی کے سبب نمایاں ہوئیں۔ان کے افسانوی جہان میں گھٹے گھٹے کردار کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی بصیرت نفسیاتی الجھاؤ کی طرف کم ہی گئی ہے۔معاملہ یہ ہے کہ عصمت کے کردار اپنی نا آسودہ امنگوں کے تزکیے کی راہ نکال لیتے ہیں جیسا کہ ''لحاف'' کی بیگم جان۔اس تزکیے کے سبب ان کے افسانوی کردار کسی بڑی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوتے۔تاہم ان کے ایک آدھ افسانے میں ہسٹیریا کے حامل نسوانی کردار مل جاتے ہیں جس کی ایک مثال ان کا افسانہ ''جہاں اور بھی ہیں'' ہے عصمت چغتائی نے اپنے عہد میں چاردیواری میں محبوس نسوانی کرداروں کو افسانے میں نمایاں کرتے ہوئے سماج کے رویوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس اعتبار سے عصمت نے نفسیاتی الجھاؤ کے داخلی موجبات کے بجائے سماجی محرکات کو نمایاں کیا ہے۔

ترقی پسند افسانے کی روایت میں ہسٹیریا کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے اس تحریک سے وابستہ تخلیقی فن کاروں کے نفسیاتی شعور کے عکاسی ہیں۔ضروری نہیں کہ ان فنکاروں نے نفسیات کے مباحث کو پڑھ رکھا ہو اور اس سے متاثر ہو کر افسانے تحریر کیے ہوں۔یہ ان کی غیر معمولی بصیرت ہے کہ جس کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے فرد کی نفسیاتی الجھنوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس باطنی منظر کو اس انداز سے اجاگر کیا کہ جس کی تصدیق نفسیاتی مباحث سے ہوتی ہے۔

منٹو کو ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ ان کے مضامین اور چند افسانے مثلاً ''ترقی پسند''، ''نفسیاتی مطالعہ'' کے علاوہ منٹو کے نام پر احمد ندیم قاسمی کے کھلے خط سے جنم لینے والے مباحث، حسن عسکری کے ساتھ مل کر ''اُردو ادب'' کا اجرا اور ترقی پسندوں کا ردِعمل، منٹو کے نام سلام مچھلی شہری اور خورشید الاسلام کے مکاتیب وغیرہ ایسے عوامل منٹو کو ترقی پسندوں کی صف میں شامل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔پھر خود منٹو کہاں کسی چھتری کا قائل تھا۔بقول انوار احمد وہ تو برصغیر کا تخلیقی ضمیر تھا، اس لیے اسے کسی سانچے میں رکھ کر دیکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

ہسٹیریا کے موضوع کے علاوہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے نفسیات خصاصاً نفسیات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس حوالے سے کئی معنی خیز سوال اُٹھائے کہ مریضانہ معاشرے میں مثالیت تلاش کرنے والے کو ہم کیوں کر دیوانہ قرار دے سکتے ہیں؟ منٹو کا یہ سوال ''انقلاب پسند'' میں بڑی شدت کے ساتھ اٹھا کہ امرا کے حریر پوش بچوں کا لباس اتار کر ننگے بچوں کو پہنانے والا سلیم کیسے ''دیوانہ'' کہلایا جا سکتا ہے؟ محمد خالد اختر کے افسانے ''لالٹین'' میں عظمت اللہ کا کردار اسی تسلسل کا حصہ ہے جو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ جنہیں دُنیا پاگل، سڑی اور دیوانہ کہتی ہے، ان کے باطن میں عمدہ ترین معاشروں کے خواب جاگزیں ہوتے ہیں۔ان خوابوں کی تعبیر جب انہیں حقیقی دُنیا میں نہیں ملتی تو وہ ازخود ایک ایسا یوٹوپیا تخلیق کر لیتے ہیں جو حقائق کی دُنیا سے ماورا ہوتا ہے۔

ہسٹیر یا کے نفسیاتی تصور کے حامل ترقی پسند افسانے اردو افسانے کی ایک جہت ہیں۔ترقی پسند افسانے میں نفسیاتی شعور کئی جہات کا حامل ہے کہ جن کا جائزہ لینے کے لیے الگ سے تحقیقی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔کرشن چندر کا افسانہ ''جانور'' فسادات کے نفسیاتی المیے کا عکاسی ہے کہ جس میں سردار سوڈھا سنگھ کو ہر وقت اپنا دایاں کان جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے کرشن چندر نے اس افسانے میں اپنی بصیرت سے ان نفسیاتی صداقتوں کو آشکار کیا ہے کہ جو شیکسپیئر کی لیڈی میکبتھ کے ہاں ملتی ہیں اور جس کا عمدہ محاکمہ فرائیڈ نے اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''شکر گزار آنکھیں'' بھی کم و بیش اسی نفسیاتی صداقت کو سامنے لاتا ہے کہ جس کا اظہار کرشن چندر نے ''جانور'' میں کیا۔ذہن پر غیر معقول خیالات کے تسلط کے حوالے سے جیلانی بانو کا ''اسکوٹر والا'' بھی قابلِ ذکر افسانہ ہے جبکہ اختر حسین رائے پوری کا افسانہ ''تلاش گم شدہ'' فرد کے باطن میں موجود تشویش کی نزاکت کو نہ صرف سامنے لاتا ہے بلکہ نفسیاتی صداقتوں کو عمدہ طور پر بیان کرنے کے ہنر کو بھی آشکار کرتا ہے۔نفسیاتی کشاکش اور باطنی عوامل کے حوالے سے ان کے دیگر افسانوں میں ''بیزاری''، ''دل کا اندھیرا'' اور ''اندھا بھکاری'' قابلِ ذکر ہیں۔

فسادات کے دوران شر پسندوں میں گھرے ہوئے افراد اپنے اپنے گھروں میں محبوس ہو کر نکلنے کے موقع کی تلاش میں رہنے والے اور اسپیشل ٹرینوں کے بے آباد مقامات پر رک جانے سے جنم لینے والے تشویش کے حامل بے بس اور مجبور انسان عالمی تاریخ کے گھناؤنے باب کا تاریک تر حصہ ہیں۔ایسے لاچار و مجبور انسان کی مسخ شدہ نفسیاتی حالت کی عکاسی ترقی پسند افسانے میں نمایاں طور پر ہوئی۔اگرچہ فسادات کے حقائق سے جنم لینے والی تشویش کو افسانہ نگاروں نے اجتماعی صورتِ حال کے تناظر میں پیش کیا مگر جب بھی اُردو افسانے میں حقیقی تشویش کے حوالے سے تحقیق و تنقید کی بات ہوگی تو ''موذیل''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''سہائے''، ''شریفن'' (منٹو) کرشن چندر کے مجموعے ''ہم وحشی ہیں'' کے علاوہ ان کا افسانہ ''جانور''، ''شکر گزار آنکھیں'' (حیات اللہ انصاری)، ''فیصلہ'' (رشید جہاں)، ''انتقام'' (خواجہ احمد عباس)، ''میرا بچہ''، ''جڑیں'' (عصمت چغتائی)، ''آواز کا انتظار'' (اقبال متین)، ''نصیب جلی''، ''ایک شہری پاکستان کا'' (رام لعل)، ''پناہ گاہ'' (جوگندر پال) وغیرہ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔مذکورہ افسانوں سے جہاں سیاسی حالات و وقعات انسان کی بے رحمی وغیرہ نمایاں ہوتی ہیں تو وہاں نفسیاتی سطح پر کچلے ہوئے لوگوں کی مسخ شدہ نفسیاتی صورت حال بھی افسانوں سے عیاں ہوتی ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ترقی پسند افسانے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر افراد کی نفسیات کی پیچیدگیوں کے ان مظاہر اور محرکات کو نمایاں کیا جو نفسیات میں ایک ٹھوس حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان نفسیاتی عوامل کو نگاہ میں رکھا کہ جو ابھی تک نفسیاتی نظریات کی دسترس سے دور ہیں۔آج ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ نظریاتی ادیبوں کی تخلیقات کا جائزہ دیگر تنقیدی دبستانوں کی روشنی میں لیا جائے اور ان کے تخلیقی پھیلاؤ کا احاطہ کیا جائے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ اور ینوی اختر، ''منظر و پس منظر''، لاہور: مکتبہ اُردو (طبع ثانی)،س۔ن،ص:۱۹۷ (طبع اوّل،۱۹۴۰ء)

۲۔ احتشام حسین جیسے بالغ نظر نقاد کا ایک نمائندہ مضمون ''اُردو افسانہ۔ایک گفتگو''، اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں اور ینوی کا سرسری تذکرہ ملتا ہے جبکہ پروفیسر قمر رئیس کی مرتبہ کتاب ''ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر'' میں ترقی پسند افسانے پر شامل مضامین میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔

۳۔ منٹو، سعادت حسن، ''منٹو کہانیاں'' (افسانوی کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشن، ۱۹۹۹ء، ص:۲۱۷

۴۔ خواجہ احمد عباس، ''نقوش''، افسانہ نمبر، شمارہ نمبر ۳۷۔۳۸، ص:۶۷